پہلا باب

امت مسلمہ اور اس کا مقصد وجود

امت کی امتیازی حیثیت:

امت مسلمہ جس وقت وجود میں لائی جارہی تھی،اس کے لانے والے نے اس کے بارے میں فرمایا:

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ (آل عمران:۱۱۰)

"تم ایک بہترین امت ہو جو سب انسانوں کے لیے وجود میں لائی گئی ہے۔"

یہ کلمات دو اجزا پر مشتمل ہیں:۔

(۱)۔مسلمانوں کی جماعت تمام انسانی جماعتوں میں سب اچھی جماعت ہو گی۔دوسری کوئی جماعت، کوئی قوم، کوئی پارٹی فکر و عمل کی خوبیوں میں اس جیسی نہ ہو گی (كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ)

(۲)۔یہ جماعت، یہ امت مسلمہ، دنیا کی عام جماعتوں، قوموں اور گروہوں کی طرح زندگی کے اسٹیج پر معمول کے مطابق یوں ہی نہیں آنکلی ہے بلکہ ایک خاص اہتمام سے نکال کر لائی گئی ہے۔اس کے لائے جانے کے پیچھے ایک خاص مقصد کام کر رہا ہے۔دنیا کے دوسرے تمام گروہوں کے اور اس کے درمیان ایک بنیادی فرق ہے،اور وہ یہ کہ یہ انہی میں سے ایک نہیں ہے۔بلکہ ان سب سے الگ اور ممتاز ہے،اور ان کی کسی خاص ضرورت کے لیے اسے وجود بخشا گیا اور اہتمام کے ساتھ بھیجا گیا اور اب وہ ہمیشہ کے لیے اسی کی بجا آوری پر مامور ہے،(أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ) چنانچہ نبی ﷺ کے ارشادات میں بھی اس امت کو صریح لفظوں میں "مبوث" یعنی بھیجی اور مامور کی ہوئی امت قرار دیا گیا ہے مثلاً فانما بعثتم میسرین ولم تبعثوا معسرین (بخاری جلد دوم)

"تم نرمی سے کام لینے والے بنا کر بھیجے گئے ہو تنگیوں میں ڈالنے والے بنا کر نہیں بھیجے گئے ہو۔"

اللہ اور رسول ﷺ کے ان ارشادات سے صاف واضح ہوتا ہے کہ دوسری تمام امتیں اور قومیں ایک سطح پر ہیں اور امت مسلمہ ایک دوسری سطح پر ہے۔وہ ایک جداگانہ نوعیت کی مالک ہے اور ایک امتیازی حیثیت کی حامل ہے۔جب اس کی نوعیت اور حیثیت دوسری تمام قوموں سے مختلف اور ممتاز ہے تو اس سے آپ یہ بات لازم ہے کہ وہ اپنے طرز فکر میں، اپنے طریق عمل میں، اپنی دلچسپیوں میں، اپنی قدروں میں، اپنی غرض ایک ایک پہلو سے وہ اپنا الگ اور مخصوص مقام رکھتی ہے اور اس کے کسی معاملے کو دوسری کسی قوم یا جماعت پر ہر گز نہیں قیاس کیا جاسکتا۔

مقصد وجود (اقامت دین)

اس وضاحت سے اتنی بات تو متعین طور سے معلوم ہو جاتی ہے کہ اس امت کے وجود کا کوئی خاص اور ممتاز مقصد ہے۔ اب دریافت طلب یہ رہ جاتی ہے کہ اس کے وجود کا یہ خاص اور ممتاز مقصد کیا ہے؟ قرآن مجید نے مذکورہ بالا الفاظ فرمانے کے معاً بعد ہی اس سوال کا بھی جواب دے دیا ہے۔ وہ فرماتا ہے:

تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ

"تم بھلائی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔"

یعنی وہ خاص کام جس کے لیے مسلمانوں کا یہ گروہ برپا کیا گیا ہے، یہ ہے کہ وہ پوری نوع انسانی کو غلط فکریوں اور غلط کاریوں سے روک کر صحیح راہ پر لائے۔

اس خاص کام یا خاص مقصد کے بیان کے لیے اللہ تعالی نے دو اور تعبیریں اختیار فرمائی ہیں۔ ان میں سے پہلی تعبیر "شہادت حق" کی ہے۔ چنانچہ اس کا ارشاد ہے:

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ (بقرۃ۔۱۴۳)

"اور اسی طرح ہم نے (اے مسلمانو!) تمہیں ایک معتدل امت بنایا ہے تاکہ تم (دوسرے تمام) انسانوں کے لیے گواہ بنو۔"

اس مفہوم کی اور انہی جیسے لفظوں میں ایک آیت سورہ حج میں بھی موجود ہے، اور اگرچہ ان میں سے کسی آیت کے اندر بھی اس چیز کی صراحت نہیں کی گئی ہے جس کی گواہی (شہادت) دینے کے لیے یہ امت مبعوث کی گئی ہے۔ مگر اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ بجائے خود بالکل صریح تھی۔ ظاہر ہے کہ شئے اسے اللہ تعالٰی کی طرف سے دی جارہی تھی اس کے سوا اور کون سی چیز ہو سکتی ہے جس کی اہل دنیا کے سامنے شہادت دینے کا اسے ذمہ دار بنایا جاتا ہے؟ اس کا ثبوت خود انہی آیتوں کے ان لفظوں میں بھی موجود ہے جو مذکورہ لفظوں کے بعد لائے گئے ہیں اور جن میں فرمایا ہے کہ "اور پیغمبر تمہارے لیے گواہ ہو۔" (وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا) غور کر لیجیے وہ کیا چیز تھی جس کی اہل ایمان کے سامنے گواہی دینے کے لیے اللہ کا رسول ﷺ بھیجا گیا تھا؟ اگر یہ چیز صرف وہ دین حق تھی جو اس پر نازل ہو رہا تھا اور اس میں دو رائیں ممکن نہیں کہ جس چیز کی گواہی دینے کے لیے "دین حق" کہہ لیجیے چاہے صرف حق۔

دوسری تعبیر "اقامت دین" کی ہے:۔

شرع لكم من الدين ما وصىٰ به نوحاً والذى اوحينا اليك وما وصينا به ابراهيم وموسىٰ وعيسىٰ ان اقيموا الدين (شوریٰ:۱۳)

"(مسلمانو!) اللہ تعالی نے تمہارے لیے وہی دین مقرر کیا ہے جس کا حکم اس نے نوح کو دیا تھا اور جس کی (اے نبی ﷺ) ہم نے تم پر وحی کی ہے اور جس کا حکم ہم نے ابراہیم کو موسیٰ کو اور عیسیٰ کو دیا تھا کہ اس دین کو قائم کرو۔"

حضرت عبداللہ بن مسعود، صحابہ کرام کا مقام اور مرتبہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

اختارهم الله لصحبته نبيه ولاقامة دينه (مشکوۃ)

"انہیں اللہ نے اپنے نبی ﷺ کی معیت اور اپنے دین کی اقامت کے لیے پسند فرمایا تھا۔"

یہ بات بھی اس امر کو ایک واقعہ بتاتی ہے کہ اس امت کی غایت وجود اللہ کے دین کی اقامت تھی۔

قرآن وحدیث کے ان تینوں بیانات کی بناپر امتِ مسلمہ کے مقصد وجود کے لیے آپ جس تعبیر کو چاہیں اختیار کر سکتے ہیں۔ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اس امت کا مقصد وجود امر بالمعروف و نہی عن المنکر ہے۔ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ "شہادت حق" ہے، اور یہ بھی کہ "اقامت دین" ہے کیونکہ یہ تینوں ایک ہی مدعا کی مختلف تعبیریں ہیں اور ان میں سے جس کو بھی استعمال کریں گے، معنی و مقصود ہر حال میں ایک ہی ہو گا۔

لیکن معنی و مقصود کی اس یکسانی کے باوجود، اگر آپ ان تینوں تعبیرات کا گہری نظر سے جائزہ لے کر ان کا ہر پہلو سے موازنہ کریں گے تو یہ پائیں گے کہ آخری تعبیر میں جو جامعت، ہمہ گیری اور جو صراحت ہے وہ دوسری تعبیروں میں نہیں ہے۔

زیادہ جامعیت اس طرح ہے اس میں "اقامت" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ اقامت کا لفظ جیسا کہ آگے چل کر وضاحت سے معلوم ہو گا ایک مکمل کیفیت کا تصور پیش کرتا ہے۔

زیادہ ہمہ گیری یوں ہے کہ متعلقہ آیت میں صرف اتنا ہی نہیں فرمایا گیا ہے کہ فلاں شئ مسلمانوں کے فرئضہ حیات ہے بلکہ یہ بھی واضح کر دیا گیا ہے کہ یہی فرئضہ ہر نبی کا اور اس کے ساتھیوں کا رہا ہے۔ دوسرے لفظوں میں گویا بات یہ فرمائی گئی ہے کہ اللہ پر ایمان لانے اور اس کی بندگی کا عہد کرنے کے معنی یہ ہیں کہ اس کے دین کی اقامت کی جائے۔

زیادہ صراحت اس طرح ہے کہ اس چیز کا ذکر جس کی اقامت اہل ایمان کو کرنی ہے متعلقہ آیت میں بالتصریح موجود ہے اور نام لے کر فرمادیا گیا ہے کہ یہ چیز "الدین" یعنی اللہ تعالیٰ کا بھیجا ہوا دین ہے۔

ان خصوصیتوں کی بناپر "اقامت دین" کی تعبیر کو غالب اصلاح ہونے کا حق حاصل ہوتا ہے۔ اس لیے امت مسلمہ کا مقصد وجود ظاہر کرنے کے لیے اسی کا استعمال زیادہ مناسب رہے گا۔

اقامت دین کا مفہوم

"اقامت دین" کی اصطلاح دو لفظوں سے مرکب ہے۔ ایک "اقامت" دوسرا "دین"۔ اس لیے اس کا مفہوم سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے ان دونوں لفظوں کے الگ الگ معنی سمجھ لئے جائیں۔

اقامت کا لفظ جب کسی ٹھوس چیز کے لیے بولا جائے تو وقت اس کے معنی سیدھا کر دینے کے ہوتے ہیں قرآن مجید میں ہے۔

یرید ینقض فاقامہ (کہف: ۷۷)

"دیوار (ایک طرف کو جھک گئی تھی اور) گرا چاہتی تھی تو اس نے اسے سیدھا کر دیا۔"

اور جب وہ کسی ٹھوس چیز کے بجائے معنوی اشیاء کے لیے بولا جاتا ہے تو اس وقت اس کا مفہوم پورا پورا حق ادا کر دینے کا ہوتا ہے۔ یعنی یہ کہ متعلقہ کام کو پوری توجہ اور کامل اہتمام کے ساتھ بہترین شکل میں انجام دے دیا جائے۔ امام اللغۃ علامہ راغب اصفہانی فرماتے ہیں:۔

اقامۃ الشئی توفیۃ وقال قل یا اھل الکتاب لسنھم علی شئی حتیٰ تقیموا النور و الانجیل ای توفون حقوقھا بالعلم و العمل (المفردات)

"کسی چیز کو قائم کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے حقوق اچھی طرح پورے کر دیئے جائیں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے پیغمبر کہہ دو اے اہل کتاب تم کسی اصل پر نہیں ہو جب تک کہ تورات اور انجیل کو قائم نہ کرلو۔ یعنی جب تک کہ علمی اور عملی دونوں حیثیتوں سے ان کے حقوق ادا نہ کر دو۔"

اس مفہوم کو ایک مثال سے سمجھیے قرآن میں نماز کی اقامت کا حکم دیا گیا ہے۔ "اقامت" کے اس مفہوم کی رو سے نماز کی اقامت یہ ہو گی کہ اسے اس کے تمام ظاہری آداب و شرائط اور سارے باطنی محاسن کے ساتھ ادا کیا جاتا رہے۔ اس طرح کہ نماز کا جو مقصد ہے وہ بحسن و خوبی حاصل ہوتا رہے لہذا دین کی اقامت یہ ہوئی کہ اس کے ماننے والے علمی اور عملی دونوں حیثیتوں سے اس کے ماننے کا حق ادا کر دیں۔

دین کا لغوی معنی اطاعت کے ہیں۔ اور اصطلاحاً اس سے مراد اللہ کی بندگی کا وہ طریقہ اور انسانی زندگی کا وہ نظام ہے جو اللہ تعالیٰ کی جناب سے پیغمبر ﷺ کے ذریعہ اس کے بندوں کو عمل درآمت کے لیے دیا گیا ہے۔ اور جس کی تفصیلات اس کی کتاب اور اس کے رسول ﷺ کی سنت میں موجود ہیں۔ ان تفصیلات کے دیکھنے سے اس بات میں کسی شک کی گنجائش مطلق نہیں رہ جاتی کہ انسانیت کا کوئی مسئلہ اور انسانی زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جو اس کے دائرے میں نہ آ گیا ہو۔ یہ دین انسان کی عقل و فہم اور اس کے دل کی گہرائیوں سے شروع ہو کر اس کی عبادت گاہوں، اس کے گھر کی چار دیواریوں، اس کے خاندانی حلقوں، اس کے تمدنی اداروں سے ہوتا ہوا اس کے تمام اجتماعی اور بین الاقوامی مسئلوں کے آخری کنارے تک پہنچتا ہے اور ہر مسئلے ہر معاملے اور ہر شعبے کے متعلق اپنی مستقل ہدایت دیتا ہے۔ وہ انسان کی کسی نجی اور پرائیوٹ زندگی کا بالکل قائل نہیں۔ جس میں وہ اپنی سی کرنے میں آزاد ہو، وہ انسانی زندگی کے لیے کسی ایسی دنیا کا وجود تسلیم کرنے کے لیے قطعاً تیار نہیں جہاں وہ خود موجود نہ ہو۔ وہ ایمانیات کو، عقائد کو، عبادات کو، اخلاق کو تقویٰ اور احسان کو تو اپنے اجزاء کہتا ہی ہے۔ بیت الخلاء کے آداب اور ازدواجی تعلقات جیسی چیزوں کو بھی اپنے سے بے تعلق نہیں قرار دیتا، وہ مجرموں پر سزا کے نفاذ کو بھی اللہ کا دین ہی کہتا ہے۔ ولا تاخذکم بھما رافۃ فی دین اللہ (نور: ۲)

اقامت اور "دین" کے ان مفہوموں کو سامنے رکھیے۔ "اقامت دین" کا مفہوم خود بخود معلوم ہو جائے گا۔ جب اقامت کے معنی علمی اور عملی دونوں حیثیتوں سے پورا پورا حق ادا کرنے کے ہیں اور دین کا مفہوم اللہ تعالیٰ کی ایسی کامل اطاعت ہے جس سے زندگی کا ایک گوشہ بھی بے تعلق نہیں اور جس کے مطالبے وہاں ختم ہوتے ہیں جہاں انسانیت کے مسائل کی آخری حد آ جاتی ہے تو اقامت دین کا مفہوم لازماً یہی ہو گا اور صرف یہی ہو سکتا ہے کہ اس دین پر ایمان رکھنے والے اس سے پوری طرح واقف ہوں، اس کے بنیادی تصورات سے، اس کے اصول سے، اس کے احکام و ہدایات سے باخبر ہوں۔ اس کے مقصد و منشا کو جانتے ہوں۔ انہیں یہ معلوم ہو کر وہ اس دنیا میں ان کی کیا پوزیشن ٹھہراتا ہے؟ ان کے وجود کی کیا غایت مقرر کرتا ہے؟ اس غایت تک پہنچنے کے لیے وسعی و عمل کی راہیں کیا تجویز کرتا ہے؟ انہیں کن کن باتوں کے کرنے کا حکم دیتا ہے اور کن کن باتوں سے روکتا ہے؟ زندگی کے مختلف شعبوں میں انہیں کیا رویہ اختیار کرنے کی تلقین کرتا ہے؟ غرض بحیثیت فرد اور بحیثیت جماعت وہ ان سے زمین پر کس طرح رہنے، کیا کرنے اور کیا بننے کا مطالبہ کرتا ہے؟ وہ یہ سب کچھ جانتے ہوں اور پھر اس جاننے کے مطابق اپنے عمل کو ڈھال لینے میں لگ جائیں۔ قرآن اور سنت کی ایک ایک ہدایت پر عمل ہو۔ شریعت کا ایک ایک حکم نافذ ہو۔ دین کے جتنے اصول ہوں ان سب پر، اور صرف ان ہی پر حیات ملی کی عمارت بنائی جائے۔ کوئی بھی معاملہ ہو نقطہ نظر صرف وہ اختیار کیا جائے جو یہ دین سکھاتا ہے اور پوری سوسائٹی پر رنگ وہ چھا جائے جو پیدا کرنا چاہتا ہے۔ یہاں تک کہ دیکھنے والوں کو پورا ماحول قرآنی اور پورا معاشرہ ایک متحرک قرآن نظر آنے لگے۔ یعنی جس طرح کوئی بلند قامت شئے سیدھی کھڑی کر دی جاتی ہے تو دیکھنے والے بیک نگاہ دیکھ لیتے ہیں کہ وہ کیا ہے اور کیسی ہے؟ اسی طرح یہ پورا دین انسانی زندگی پر اس طرح غالب اور نافذ ہو جائے کہ وہ دور سے "دیکھ" اور "پہچان" لیا جائے۔

دوسرا باب

مقصد فراموشی اور اس کے نتائج

اصول و مقاصد کی اہمیت:

کسی خاص اور اہم مقصد کی علمبردار جماعت کی زندگی اس بات پر موقوف ہے کہ اس کی نگاہ اپنے مقصد اور نصب العین پر اچھی طرح جمی رہے اور مقصد و نصب العین پر نگاہ کا جمار ہنا اس بات پر موقوف ہے کہ اس مقصد تک پہنچنے کے جو اصول ہیں انہیں یہ جماعت دل و جان سے عزیز رکھتی ہو۔ اگر اس کے افراد میں اپنے مقصد کا گہرا عشق، اور اپنے اصول کا گہرا یقین موجود ہو تو موت اس کو آنکھیں نہیں دکھا سکتی۔ یہ عشق و یقین اس بات کی ضمانت ہے کہ اس جماعت سے عزت و اقبال منہ نہیں موڑ سکتے۔ اور پھر اسی عشق و یقین کا یہ لازمی و فطری تقاضا ہے کہ جماعت کا اجتماعی نظم و نسق اس کے اپنے ہاتھوں میں ہو۔ وہ ایک لمحے کے لیے بھی اس صورت حال کو برداشت نہیں کر سکتی کہ کوئی ایسا اجتماعی نظم اس پر مسلط ہو جو اس کے محبوب اصولوں پر تعمیر نہ کیا گیا ہو اور اگر سوء اتفاق سے اس پر کبھی ایسے دن آہی پڑے تو اس کا ایک ایک فرد اس مچھلی کی طرح بے قرار ہو رہے گا جس کو پانی سے نکال کر خشکی پر ڈال دیا گیا ہو۔ اور اپنے مقصد، اپنے اصول اور اپنے نظام حیات کی محبت اسے موت کی بازی کھیلنے پر مجبور کر دے گی۔ وہ رائج الوقت نظام کے خلاف سراپا اضطراب بن جائے گا۔ اور اس کے ساتھ کسی قسم کے اختیاری تعاون یا مداہنت کا تصور تک اس کے لیے ناقابل برداشت ہو گا، کیونکہ وہ جانتا ہو گا کہ میری انفرادی اور جماعتی زندگی کا تشخص جن اصولوں سے قائم ہے ان کا اسی نظام نے گلا گھونٹ رکھا ہے۔ یہ اضطراب سکون سے اسی وقت بدل سکے گا جب کہ وہ اس نظام کی دھجیاں بکھیر چکا ہو گا۔

اس کے بخلاف اگر کسی جماعت کے اندر اپنے اصولوں کا یقین مرجھا گیا اور اپنے مقصد و نصب العین کا عشق بے جان ہو گیا ہو تو یہ اس کے مٹ جانے کے ناقابل انکار علامت ہے۔ اس کم یقینی اور سرد مہری کے نتیجے میں اگر اس کے اندر کسی دوسرے نظام کے ساتھ تعاون اور مداہنت کا رجحان ابھر آئے تو اس پر ہرگز کوئی تعجب نہ کرنا چاہیے اور کسی ایسے رجحان کا ابھر آنا اس کے سوا کوئی معنی نہیں رکھتا کہ حیات ملی کے محافظوں نے جزانہ کی کنجیاں دشمنوں کے حوالہ کر دیں۔ اور اب اس پونجی کا لٹ جانا بس کوئی دن کی بات ہے جسے کوئی معجزہ ہی روک سکتا ہو تو روک سکے۔ پھر چونکہ زوال ہو یا کمال اس دنیا میں کسی کی فطرت میں ٹھیراؤ نہیں ہے۔ اس لیے اس کے یقین و عشق میں اس زوال کا عمل اپنی رفتار سے برابر آگے بڑھتا جاتا ہے۔ اور آخر کار ایک مقام پر پہنچ کر وہ اس لٹی ہوئی پونجی کے لٹ جانے کے احساس کو بھی لوٹ لیتا ہے۔ یہ وقت ہوتا ہے جب افراد جماعت میں کسی دوسرے اصول و نظام زندگی کی غلامی کا ذوق پیدا ہو جاتا ہے۔ جب وہ تعاون اور مداہنت کی بھی حدیں پھاند چکے ہوتے ہیں۔ جب انہیں اپنا اصولی اور اخلاقی موقف ہی نہیں یاد رہ جاتا۔ جب وہ اپنے مقصد اور اصول سے اتنے بے گانہ ہو جاتے ہیں کہ ان کا عملی رویہ تو ان چیزوں کے غلط اور ناقابل قبول ہونے کی گواہی دینے ہی لگتا ہے ان کی نظری طور پر بھی یہ گوارا نہیں رہ جاتا کہ معاشرے اور مملکت کی باگ ڈور پھر سے ان اصولوں ک ہاتھ میں دے لیئے جانے کی کوئی جدوجہد کی جائے اور اگر کسی گوشے سے اس طرح کی پکار بلند ہو جاتی ہے تو وہ اسے حیرت کے کانوں سے سنتے اور اختلاف و عناد کی زبانوں سے اس کا جواب دیتے ہیں۔ یہ وہ مقام ہے جہاں پہنچ کر جماعت بحیثیت ایک اصولی جماعت ہونے کے فنا ہو جاتی ہے اور اس کے نالائق فرزند اپنے ہی ہاتھوں اسے قبر کی گہرائیوں میں سلا دیتے ہیں۔

ان دونوں موخرالذکر صورتوں میں یہ ضروری نہیں ہے کہ جماعت مادی حیثیت سے بھی بے نام ونمود ہو جائے اور دنیا کی دولت اور سیاست میں اس کے لیے کوئی جگہ باقی نہ رہ جائے۔اس کے برعکس یہ عین ممکن ہے کہ عام مادی تدبیروں پر عمل کرکے وہ اقوام عالم کی صفوں میں نمایاں اور عظیم الشان پوزیشن کی مالک ہو جائے۔اس کے پاس حکومت کا کروفر ہو، دولت کی شان وشوکت ہو، قومی اقتدار اور بین الاقوامی وقار ہو۔ لیکن اپنی ان تمام شوکتوں اور عظمتوں کے باوجود اس مقصد اور ان اصولوں کے نقطۂ نظر سے، جن پر اس جماعت کی بنیاد قائم تھی اس کا وجود وعدم برابر ہے۔ جن اصولوں کی لاش ان کے پیروں تلے روندی جارہی ہو ان کو اس سے کیا بحث کہ وہ ذلت کی خاک پر ہے یا عظمت کے آسمان پر۔ ان کو اگر بحث ہے تو صرف اس بات سے کہ زندگی کے میدان میں ہمیں غالب وکار فرما بنانے کی، اس کے افراد کے دلوں میں کتنی لگن ہے؟ اور وہ اس کے لیے اپنی جان، اپنے مال، اپنے ذرائع اور اپنی قوتوں کی کتنی قربانیاں دے رہے ہیں؟ لیکن اگر یہ کچھ نہیں ہے تو اپنی زبان حال سے یہ اصول ان سے اپنی بے تعلقی کا اعلان کردیں گے۔ اور پھر انصاف اور دیانت کا کھلا تقاضا ہوگا کہ یہ لوگ بھی اپنی طرف سے اس اعلان کے برحق ہونے کی تصدیق کردیں، اب ان کے لیے یہ کسی طرح بھی جائز نہیں رہ جاتا کہ وہ ان اصولوں کا نام بدستور اب بھی لیتے جائیں اور اپنے آپ کو اس جماعتی لقب سے موسوم کرتے رہیں جو کبھی ان اصولوں کی صحیح نمائندگی کے سبب ہی انہیں ملا تھا، کیونکہ اب وہ ان کے نمائندے باقی نہ رہے۔

اصول اسلام کی شرکت بیزاری

اس اصولی حقیقت کا اطلاق دنیا کی ہر جماعت پر ہوتو ہے امت مسلمہ بھی اس کلیہ سے کسی طرح مستثنیٰ نہیں ہوسکتی۔ اس کی بھی اپنی واقعی زندگی کا دار و مدار، اول وآخر، اپنے اصل مقصد وجود اور اپنے اصول حیات ہی پر ہے۔ اس کے لیے بھی اپنے اصولوں کی اہمیت ویسی ہی ہے جیسی کہ کسی اور جماعت کے لیے اس کے اصولوں کی ہوسکتی ہے بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ۔ کیونکہ زندگی کے دوسرے مسلکوں کے مقابلہ میں اسلامی مسلک حیات کی ایک ممتاز توعیت ہے وہ ایک ایسی خصوصیت کا حامل ہے جو کسی اور مسلک (ازم) اور نظام میں نہیں پائی جاتی۔ دنیا میں اسلام کے علاوہ دوسرے جتنے بھی نظام پیش کیے گئے ہیں وہ سب انسان کے اپنے دماغ کی پیداوار ہیں۔ اس لیے مزید غور اور نئے تجربات اور معلومات کی روشنی میں ان کے اندر ترمیم کی گنجائش ہمیشہ موجود رہتی ہے۔ حتیٰ کہ ضرورت جب مجبور کردیتی ہے تو ان میں کتنے ہی بیرونی اصولوں کا پیوند بھی لگالیا جاتا ہے جس پر ان کے مخلص سے مخلص اور پرجوش سے پرجوش عقیدت مندوں کو بھی عموماً کسی احتجاج کا خیال تک نہیں آتا۔ لیکن اسلام کا معاملہ اس باب میں بالکل دوسرا ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ میرا پیش کیا ہوا مسلک حیات اور میرے اصول کسی انسانی دماغ کا نتیجہ نہیں ہیں بلکہ یہ اس علیم وخبیر کے تجویز فرمائے ہوئے ہیں جو نوع انسانی کے فطری تقاضوں، اس کی انفرادی اور اجتماعی مصلحتوں اور اس کی تمام داخلی اور خارجی ضرورتوں کا صحیح اندازہ داں ہے۔ اور جس کی نگاہ سے انسانی سرشت کا کوئی گوشہ بھی مخفی نہیں۔ اس لیے یہ مسلک کامل عدل اور توازن کا مسلک ہے فطرت کے ٹھوس حقائق پر مبنی ہے عالمگیر اور جہانی ہے۔ وقت اور جگہ کی حد بندیوں سے آزاد اور کسی ترمیم کی ضرورت سے ہمیشہ کے لیے بے نیاز ہے۔ بشری علوم و افکار اور نئے نئے تجربات اور معلومات اس کی کسی ایک اصل پر بھی کبھی انگلی نہیں رکھ سکتے۔ اس لیے اگر کسی نے اس کی پیروی کا دعویٰ رکھتے ہوئے بھی ایسی کوئی جسارت کرنی چاہی تو اس کا شمار اس کے باغیوں میں ہوگا، نہ کہ فرمانبرداروں میں۔

کہا جاسکتا ہے کہ اسلام کا یہ رویہ بہت سخت اور سرتاسر آمرانہ ہے لیکن یہ بات وہی شخص کہہ سکتا ہے جو یا تو اسلام کے اس دعویٰ ہی کا منکر ہو کر وہ ایک خداوندی مسلک حیات ہے۔ یا پھر وہ حقیقت اور گمان میں فرق ہی کرنا نہ جانتا ہو اور علم الٰہی کو علم انسانی پر قیاس کرتا ہو۔ ورنہ اس سے بڑا عقلی دیوالیہ پن اور کیا ہوگا کہ ایک شخص یہ بھی کہتا ہو کہ اسلام کے پیش کیے ہوئے اصولوں کا سرچشمہ علم الٰہی ہے اور ساتھ ہی یہ بھی کہتا ہو کہ یہ اصول قابل ترمیم بھی ہوسکتے ہیں۔ اس مسلک حیات کا کٹر سے کٹر مخالف بھی ازروئے انصاف کسی کو یہ حق آزادی نہیں دے سکتا کہ ایک طرف تو وہ اسلام

کی عقیدت کا دم بھرے، دوسری طرف اس کے اصولوں پر عمل جراحی بھی کرتا پھرے۔ ہاں اس کو یہ آزادی ہر وقت حاصل ہے کہ وہ سرے سے اسلام ہی کو چھوڑ دے اگر اس کے پورے دعوے کی پوری سچائی میں اسے تردد ہو اور اس کے نزدیک اس کے اصول ترمیم واصلاح کے محتاج ہوں۔ اس فرق کو ذہن نشین کر لینے کے بعد یہ بات آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہے کہ اگر کسی اور جماعت کے لیے اپنے مسلک کے مخالف اصولوں سے تعاون یا مصالحت کرنا ممکن ہو تو ہو، مگر اسلام کے نام پر بننے والی جماعت کے لیے تو کسی غیر اسلامی نظام زندگی سے مصالحت یا مداہنت کا تصور بھی حرام ہے چنانچہ جب قرآن نازل ہو رہا تھا اور ملت اسلامیہ کی بنیادیں بھری جا رہی تھیں تو اس کی مخالف کیمپ سے اس پالیسی کے اختیار کر لینے کی بار بار ترغیب ملتی رہی۔ مگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے قطعی ہدایت تھی کہ پیغمبر ﷺ اور ان کے ساتھی اس ترغیب کو ہرگز خاطر میں نہ لائیں۔ مثلاً اس کیمپ نے اپنی اسلام دشمن تدبیروں اور سرگرمیوں کو کسی طرح بھی کامیاب ہوتے نہ دیکھا تو اس نے نبی ﷺ کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ:

ائت بقرآن غیر ھذا او بدلہ (یونس)

"اس قرآن کے بجائے کوئی دوسری کتاب لائیے، یا پھر اس میں ردوبدل کر دیجیے۔"

اس تجویز کے پیش کرنے والوں کا منشاء صاف ظاہر ہے دراصل یہ ایک تجویز یا مطالبے سے زیادہ ان کی طرف سے ایک پیشکش تھی۔ ان کا مدعا یہ تھا کہ محمد ﷺ، اپنی تعلیمات میں ہمارے مشرکانہ افکار و عقائد کے لیے بھی کوئی گنجائش نکال دیں تو ہم ان کی مخالفت سے باز آجائیں گے۔ اور ان کی بات مان کر ان کے پیرو بن جائیں گے۔ ان کی اس تجویز یا پیشکش کا جو جواب اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ سے دلایا وہ یہ تھا:

قل مایکون لی ان ابدلہ من تلقآئ نفسی ان اتبع الا مایوحیٰ الی (یونس: ۱۵)

"ان سے کہہ دو کہ مجھے اس بات کا قطعاً کوئی استحقاق نہیں کہ میں اپنی طرف سے اس قرآن میں کوئی ردوبدل کر دوں، میں تو بس اس چیز کی پیروی کرتا ہوں جو میری طرف وحی کی جاتی ہے۔"

اصولی اور بنیادی باتیں تو خیر بڑی چیز ہوتی ہیں اللہ تعالیٰ نے تو اپنے پیغمبر کو اس بات سے بھی پوری سختی کے ساتھ خبردار کر دیا تھا کہ خواہ حالات کا تقاضا اور وقت کی مصلحت کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ وہ شریعت کے کسی ایک جزوی قانون کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتے۔

ان احکم بینھم بما انزل اللہ ولا تتبع اھوآءھم واحذرھم ان یفتنوک عن بعض ما انزل اللہ الیك (مائدہ: ۴۹۰)

"اے پیغمبر ﷺ! ان کے درمیان اس قانون کے مطابق فیصلہ کرو جسے اللہ نے نازل فرمایا ہے اور ان کی خواہشیوں کی پیروی نہ کرو، اور دیکھو! اس بات سے ہوشیار رہو کہ کہیں نہ لوگ تم کو اس ہدایت کے کسی جز سے (غافل کر کے) فتنہ میں نہ ڈال دیں جس کو اللہ نے تم پر اتارا ہے۔"

یہ تو اسلامی تعلیمات میں کسی بنیادی یا جزئی ترمیم کی خواہش اور کوشش کا معاملہ تھا اس کے بعد دوسرے درجہ پر ان کی ایک اور خواہش اور کوشش ہوئی اور وہ یہ کہ کاش محمد ﷺ، تبلیغ دین کے بارے میں مداہنت سے کام لیں تو وہ بھی یہی پالیسی اختیار کر لیں۔ ودوالوتدھن فیدھنون (قلم: ۹) اور یوں یہ کش مکش ختم ہو جائے۔

"مداہنت سے کام لینے" کا مطلب یہ تھا کہ رسول ﷺ شرک کی تردید سے باز آجائیں۔ اور اپنی دعوت توحید کو صرف اثباتی پہلو سے پیش کرنے پر اکتفا کر لیں۔ گویا ان کی پہلی تجویز یا پیشکش، اسلام اور شرک کا آمیزہ بنا لینے کی خواہش تھی۔ تو دوسری پیشکش اسلام اور شرک کے "پرامن باہمی وجود" کی خواہش تھی۔ مگر جس طرح پہلی کے منظور کر لیے جانے کو ناممکن فرمایا گیا اسی طرح اس دوسری خواہش کو بھی یک لخت ٹھکرا دیا گیا۔ اور اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ کو یہی حکم دیا کہ اس طرح کی باتیں ہرگز نہ مانیں۔ (فلا تطع کل افاكٍ اثیم)

یہ قرآنی تصریحات اسلام کے اصولوں ہی کا نہیں بلکہ اس جمیع تعلیمات اور اس کے مخصوص مزاج، سب کا مقام بالکل واضح طور پر متعین کر دیتی ہیں۔ان کے بعد کسی شخص کو یہ کہنے کی اجازت ہر گز نہیں دی جاسکتی کہ اسلام کو اپنا لینے یا اپنائے رکھنے کے باوجود اس کے اصولوں کی پیروی میں انسانی آزاد ہے اور حسبِ ضرورت ان میں ترمیم کر سکتا ہے۔

مقصد شناسی کا معیاری نمونہ

عملاً آج امت مسلمہ کی جو حالت بھی ہو مگر اپنی زندگی کے آغاز میں ہر بااصول جماعت کی طرح یہ جماعت بھی اپنے مقصد کا گہرا عشق اور اپنے اصولوں کا سچا یقین لے کر اٹھی تھی۔اور اس طرح اٹھی کہ رکاوٹوں کی کوئی بڑی سے بڑی چٹان بھی اس کا رخ نہ موڑ سکی۔اس راہ میں اسے کیا کچھ پیش نہیں آیا؟ جانی اور مالی مصیبتوں نے اس پر یورش کی، سخت ترین خطرات نے اسے دھمکایا، رات کی نینداس کی چھٹی، دن کا سکون اس کا برہم ہوا۔ قید و بند کی آزمائشوں نے اسے آنکھیں دکھائیں۔ مگر تاریخ گواہ ہے اور اس گواہی کو کوئی بھی جھٹلا نہیں سکتا کہ ہولناک مصائب اور مشکلات کے اس امنڈتے ہوئے طوفان میں یہ جماعت اپنے اصل موقف سے ایک انچ ہٹنے پر بھی کبھی راضی نہیں ہوئی۔حالانکہ اگر وہ مصالحت اور مداہنت کو ذرا بھی راہ دے دیتی تو یہ سارا ہنگامۂ مصائب ایک دم سرد پڑ جاتا۔دن رات کی بے اطمینانیاں امن و سکون سے بدل جاتیں۔ معاشی تنگیاں بھی دور ہو جاتیں اور پورا عرب اس کی سیاسی برتری کو بھی بڑی آسانی سے تسلیم کر لیتا۔ جیسا کہ تاریخ[ا] بتاتی ہے اور قرآن کے کھلے ہوئے اشارات سے ثابت ہوتا ہے۔ لیکن اس کے لیڈر اور پیرو بھی جانتے تھے کہ یہ مداہنت، یعنی شرک اور توحید کے پر امن باہمی وجود کی دعوت، ان کے لیے موت کی دعوت ہے کیونکہ اپنے اصولوں کو چھوڑ دینے کے بعد ہمارا وجود اپنے مقصد کے لحاظ سے بالکل بے معنی ہو کر رہ جائے گا۔اس لیے یہ لوگ آگ اور خون کے طوفانوں میں بھی اپنے مرکز پر جمے رہتے۔اور حالات کی کوئی سازگاری یا مصلحت انہیں اپنے مسلک سے بال برابر بھی نہ ہٹا سکی۔ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انہوں نے تمام ہنگامی مسئلوں، مادی مصلحتوں، تدبیروں اور وقت و ماحول کے تقاضوں سے آنکھیں بند کر لی ہیں۔بس ایک "جنون" ہے جس نے انہیں "عقل و دانش" کا دشمن بنا ڈالا ہے۔ چنانچہ اس زمانے کے سیاست دانوں اور مدبروں کا متفقہ فیصلہ ان کے بارے میں یہی تھا کہ "انہیں ان کے دین نے فریب میں مبتلا کر رکھا ہے۔"(**غرھولآء دینھم**)اور یہ کہ "**سفھاء**"ہیں۔

اگرچہ دنیا نے جلد ہی اس "خود فریبی" اور "سفاہت" کی حقیقت دیکھ لی اور زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ تاریخ انسانی کا وہ حیرت انگیز انقلاب وجود میں آیا جس کی منطقی توجیہہ کرنے میں بڑی بڑی عقلیں دنگ ہیں۔ جن کو اپنے گھروں میں بھی سر چھپانے کی جگہ نہ ملتی تھی، قیصر و کسریٰ کے تاج ان کے قدموں پر آپڑے، اور ایک صدی بھی ختم نہ ہونے پائی تھی کہ وہ یورپ، ایشیا اور افریقہ کے بیشتر حصوں پر چھا گئے۔صرف ان کی زمینوں پر ہی نہیں بلکہ وہاں رہنے والوں کے دلوں اور دماغوں پر بھی۔ یہ سب کچھ یقیناً اسی گہری فدویت اور وفاداری کے طفیل ہوا جو ان کے دلوں میں اپنے مقصد وجود اور اپنے اصول حیات کے لیے موجود تھی اور جس نے انہیں انہی کے لیے جینا اور مرنا سکھا دیا تھا۔

ا۔ قریش نے نبی ﷺ کے سامنے لفظوں میں یہ پیش کش کی تھی کہ اگر ہمارے معبودوں کے خلاف تنقیدیں کرنے سے باز آجائیں تو ہم نہ صرف یہ کہ آپ ﷺ کی مخالفت ترک کر دیں گے بلکہ آپ ﷺ کی خواہش مال و دولت بھی آپ ﷺ کی خدمت میں لا کر ڈھیر کر دیں گے اور آپ ﷺ کو اپنا سردار بلکہ بادشاہ بنا لیں گے۔(سیرت ابن ہشام۔جلد اول)

مقصد شناسی کا زوال

اسلام کے اس ابتدائی دور کے گزر جانے کے بعد اس امت پر وہ دور آیا جب اس کے افراد کے ذہنوں میں اپنے مقصد زندگی کے نقوش ماند پڑنے شروع ہوئے۔اور مختلف اسباب کے تحت ان کے اندر مداہنت کی بیماری جڑ پکڑنے لگی اور زمانے کے ساتھ ساتھ برابر ترقی کرتی گئی۔غیر اسلامی اصول و نظریات مسلمانوں میں اس طرح پھیلنے لگے جیسے کسی دریا کا بند ٹوٹ گیا ہو۔ان کی روک تھام کے لیے علمائے حق کی طرف سے بہت کچھ کوششیں بھی ہوتی رہیں۔مگر ناتربیت یافتہ عوام کی خام مذہبیت اور حکومتوں کی نافرض شناسی نے ان کی کوششوں کو پوری طرح کامیاب نہ ہونے دیا،اور یہ بیماری مسلم معاشرے کے اندر آہستہ آہستہ اسلامی اصولی وافکاری جڑیں کھوکھلی کرتی رہی۔جب تک اس جماعت کا سیاسی اقتدار قائم رہا اس وقت تک تو ان اصولوں کے بارے میں اس نے مجموعی حیثیت سے خود فراموشی اور خودکشی کی راہ نہیں اختیار کی۔مگر جب سیاسی زوال نے بھی اسے آلیا تو اس فکری زوال کی تیز رفتاری سیلاب سے باتیں کرنے لگی۔اور ہوتے ہوتے اب وہ وقت آپہنچا ہے کہ یہ جماعت اپنے آپ کو گویا پہچانتی بھی نہیں۔اس کے افراد کی بہت بڑی اکثریت اپنے اصول و مقاصد اپنے مسلک اور اپنے وجود کی غرض و غایت کو اس طرح بھول چکی ہے کہ اگر ان چیزوں کو سامنے رکھا جائے تو وہ نہ صرف یہ کہ ان سے اجنبیت محسوس کرتی ہے بلکہ بسا اوقات پورے اطمینان اور ادعائے تحقیق کے ساتھ اس کو غیر اسلام یا زائد از اسلام ثابت کرنے کی کوشش کرنے لگتی ہے جو چیزیں ان اصولوں کے بالکل مخالف ہیں وہ ان پر دیوانہ وار ٹوٹ پڑتی ہے اور انہیں مطابق اسلام قرار دینے پر مصر ہو جاتی ہے۔نتیجہ یہ ہے کہ ان کی تمام تر جدوجہد اپنے ہی مقصد حیات کی پامالی میں صرف ہو رہی ہے۔اگرچہ خوش فہمی یہ ہے کہ یہ سب کچھ اسلام اور امت مسلمہ کی سرفرازی کا باعث ہو گا بظاہر یہ محض ایک دعویٰ ایسا ہے جو دلیل سے بے نیاز ہے۔اللہ نے جس کسی کی پیشانی پر دو آنکھیں دی ہیں وہ خود دیکھ سکتا ہے کہ حقیقت واقعہ اس کے سوا اور کچھ ہے ہی نہیں۔

اس سے انکار نہیں کہ ایک چھوٹی سی اقلیت ایسے لوگوں کی بھی اس جماعت میں موجود ہے جو بحمد اللہ خود فراموشی اور خودکشی کے اس مقام تک ابھی نہیں پہنچی ہے بلکہ اس کی نگاہ اپنے نصب العین کے جلوؤں سے بھی تک آشنا ہے اور وہ اسلام کے اصول و مقاصد کی یاد اپنے سینے سے لگائے ہوئے ہے،لیکن انکار اس بات کا بھی تو نہیں کیا جا سکتا کہ اس خود شناس اقلیت کے بیشتر افراد کا حال بھی عملی نقطہ نگاہ سے کچھ قابل اطمینان نہیں اور ان کے اندر یہ یاد محض ایک متبرک یادگار بن کر رہ گئی ہے۔جس میں زندگی کی حرارت یا تو رہی نہیں یا مدھم پڑ چکی کہ محسوس نہیں ہوتی۔حالات کی ناسازگاری اور مخالف قوتوں کی قہاری نے ان کے سروں میں وہ سودا ہی باقی نہیں رہنے دیا جس کے بغیر کسی بڑے مقصد اور اصول کا نام لینا کچھ زیب نہیں دیا کرتا۔اس لیے ان لوگوں نے بھی خاموش مصالحت کی پرامن روش اختیار کر رکھی ہے اور اس بات کی احتیاط رکھنا گویا ان کی مستقل پالیسی بن گئی ہے کہ ان پر "سیاست وتدبر" کی طرف سے "مذہبی مجنون" ہونے کا الزام نہ لگنے پائے۔وہ دیکھتے اور جانتے سب کچھ ہیں مگر اپنے کو یہ "سمجھا کر" خاموش ہیں کہ دین میں آسانی رکھی گئی ہے۔اللہ تعالیٰ نے کسی شخص کو اس کی طاقت سے زیادہ مکلف نہیں قرار دیا بلکہ ایسے اقدام و عمل سے باز رہنے کی وصیت فرمائی ہے جس میں سلکے ہوں۔

امت "نقمت بقدر رحمت" کے قانون کی زد میں

ان حالات میں یہ جماعت اگر آج دنیوی جاہ و اقبال کی مالک ہوتی تو بھی اسلام کو اس سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔کیونکہ اس کا مجرد سیاسی اقتدار اس کی نظروں میں کوئی وقعت رکھتا ہی نہیں،اس کو تو جو کچھ بحث اور دلچسپی ہے صرف اپنی اقامت سے ہے اس نصب العین کو پس پشت ڈال کر اس کے نام لینے والوں نے ہفت اقلیم کی شہنشاہی بھی حاصل کر لی تو اس کے کسی کام کی؟ مگر قدرت نے یہ چیز بھی تو آج ان کے پاس باقی نہیں رہنے دی۔انہوں

نے اپنے مقصد وجود کو دیوار پر پھینک کر جو کچھ پایا وہ محکومی یا نیم محکومی کا وہ داغ ہے جو ہر جماعت کی پیشانی پر تو لگ سکتا ہے مگر سلطان کائنات کی پارٹی.................. حزب اللہ کی پیشانی پر ہر گز نہیں لگ سکتا۔ یہ داغ اتنا گھناؤنا ہے کہ ہر دیکھنے والے کو اس پر حیرت ہوتی ہے۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح کہ امت کے ابتدائی دور میں اس کے عروج کو دیکھ کر حیرت ہوا کرتی تھی یعنی عروج وزوال کے عام فلسفے کی روسے امت مسلمہ کا عروج بھی ایک معجزہ تھا اور اب اس کا زوال بھی ایک "جوابی معجزہ" ہے۔ عقلیں نہ اس غیر معمولی اقبال کی کوئی اطمینان بخش توجیہہ کر پاتی ہیں اور نہ اس غیر معمولی ادبار کی.................. حد یہ ہے کہ خود اس امت کی بہت بڑی اکثریت بھی حیرت زدہ ہے کہ یہ کیا ہو گیا؟ وہ رہ رہ کر سوچتی ہے کہ آخر ہماری ایسی زبوں حالی کا سبب کیا ہے؟ ہمیں یہ تسلیم ہے کہ ہمارے ایمان میں کمزوری آگئی ہے ہم بد عمل ہو گئے ہیں۔ ہمارے اخلاق تباہ ہو چکے ہیں۔ ہم احکام دین سے غافل ہیں۔ یہ سب کچھ سہی مگر پھر بھی برے بھلے جیسے ہیں آج اس دنیا میں صرف ہم توحید کے تنہا علم بردار ہیں۔ ہم اگر سر جھکاتے ہیں تو خدا ہی کے سامنے جھکاتے ہیں اس کے رسول پاک ﷺ کا حلقۂ اطاعت ہے تو صرف ہماری گردنوں میں ہے اس کے احکام پر اگر کچھ عمل کرتے ہیں تو ہم ہی کرتے ہیں.................. اور ہمارے بالمقابل ساری دنیا کافر و مشرک ہے۔ خدا کی باغی اور توحید کی منکر ہے۔ رسول ﷺ کی مخالف اور قرآن کی دشمن ہے پھر یہ کیا بات ہے کہ ہم پست اور وہ سربلند، ہم مفلس اور وہ دولت مند، ہم ذلیل و خوار اور وہ صاحب اقتدار، ہم غلام و محکوم اور وہ آزاد و حکمراں! حالانکہ جب ہم بہر حال غیروں کی بہ نسبت اللہ سے زیادہ قریب ہیں تو ان کے مقابلے میں ان الٰہی انعامات کے زیادہ مستحق ہم تھے کہ نہ وہ۔

یہ حیران کن سوال دراصل اس لیے پیدا ہوتا ہے کہ ہم قوموں کے عروج وزوال کے اس فلسفے سے ناواقف ہو گئے ہیں۔ جسے قرآن حکیم نے بیان فرمایا ہے۔ ورنہ طبعی اور اخلاقی دونوں حیثیتوں سے ہم ٹھیک اسی مقام پر ہیں جہاں ہونا چاہیے تھا۔ صورت واقعہ یہ ہے کہ زندگی کے میدان میں دو قسم کے قوانین کار فرما ہیں ایک تو قوانین طبعی دوسرے قوانین اخلاقی ا۔ قوموں کے اٹھانے اور گرانے میں یہ دونوں ہی قسم کے قوانین کام کرتے ہیں۔ مگر دونوں میں ایک فرق ہے اور وہ یہ کہ تنہا قوانین طبعی تو ایک قوم کو میدان مقابلہ میں فتح و غلبہ دلا سکتے ہیں۔ لیکن قوانین اخلاقی میں مشیت نے یہ قوت نہیں رکھی ہے کہ وہ طبعی قوانین کی تھوڑی بہت مدد لیے بغیر بھی اکیلے ہی کسی قوم کو غالب و فتح مند بنا دیں۔ قوانین اخلاقی کو دراصل قوموں کی باہمی کشمکش اور جنگی معرکوں میں "خصوصی اختیار فیصلہ" کا مقام حاصل ہے اور اس خصوصی اختیار کا استعمال وہ طبعی قوانین اور مادی قوتوں کی موجودگی ہی میں کرتے ہیں یعنی اگر دونوں فریق جنگ صرف مادی تیاریوں کے ساتھ نبرد آزما ہوں تو فتح اس کی ہوگی جو لڑائی کے اسباب و ذرائع زیادہ لے کر میدان مقابلہ میں آیا ہو گا اور اگر یک طرف صرف مادی قوتیں ہوں اور دوسری طرف محض اخلاقی اور روحانی قوتیں ہوں تو فریق ثانی کا شکست کھانا یقینی ہے بلکہ اسباب و علل کی اس دنیا میں فی الواقع یہ مقابلہ کوئی مقابلہ ہی نہیں۔ لیکن اگر مادی تدابیر اور اسباب و ذرائع کے اعتبار سے دونوں فریق برابر ہوں مگر ساتھ ہی ایک فریق اخلاقی قوتوں سے بھی مسلح ہو تو بلاشک و شبہ اسی کو غلبہ حاصل ہو گا اور ان کی اخلاقی قوتیں بڑھ کر اس جنگ کا فیصلہ اسکے حق میں کر دیں گی۔ جسے فریقین کے یکساں مادی سروسامان کے باعث بظاہر کبھی ختم ہی نہ ہونا چاہیے تھا۔ بلکہ اس سے بھی بڑھ کر قرآنی تصریحات تو یہاں تک بتاتی ہیں کہ اگر مادی وسائل میں وہ فریق مخالف کا دسواں حصہ ہو تو بھی اس کی اخلاقی قوتیں "اختیار فیصلہ" بن کر اسے فتح یاب بنا دیتی ہیں اور یہ اس طرح ہوتا ہے کہ یہ قوتیں اللہ تعالیٰ کی غیبی مدد اور مافوق الطبیعی نصرت کا ذریعہ بن جاتی ہیں۔ بشرطیکہ ایک طرف تو اس نے اپنے مقدور بھر مادی وسائل و تدابیر سے کام لینے میں دریغ نہ کیا ہو اور دوسری طرف اپنے ایمان کو خوب راسخ اور اپنے اعمال کو صالح بنا لیا ہو، یا یوں کہیئے کہ اس کے اندر اپنے اصولوں کا حقیقی عشق اور اپنے مسلک زندگی کا زندہ جنون موجود ہو۔ اس غیبی مدد اور مافوق الطبیعی نصرت کے اللہ تعالیٰ کی طرف سے صریح وعدے کیے گئے ہیں، مثلاً:

(ا)۔ کم من فئة قليلة غلبت فئة كثيرة باذن الله (بقرۃ:۲۴۹)

(۲)۔ولا تھنوا و لا تحزنوا و انتم الاعلون ان کنتم مؤمنین۔(آل عمران:۱۳۹)

ا۔ "اخلاق" سے یہاں مراد حقیقی دینی اخلاق ہیں نہ کہ افادی اور تجربی اخلاق، ورنہ افادی اخلاقیات سے بھی کوئی قوم اگر بے بہرہ ہو تو وہ محض طبیعی قوانین کے بل پر غلبہ نہیں حاصل کر سکتی۔اس جگہ افادی اخلاقیات کو بھی طبیعی قوانین ہی کے اندر شمار کیا گیا ہے۔کیونکہ وہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے مادی تدابیر کے سوا کچھ نہیں۔انہیں اخلاق کہنا ہی سرے سے غلط ہے۔

کتنی ہی چھوٹی جماعتیں بڑی جماعتوں پر اللہ کے حکم سے غالب ہوتی ہیں۔
یہ سست پڑو اور نہ غمگین پڑو اور نہ غمگیں ہو۔تم ہی اونچے رہو گے بشر طیکہ تم مومن ہو۔

(۳)۔ان یکن منکم عشرون صابرون یغلبوا مائتین۔(انفال:۶۵)
"اگر تمہارے بیس ثابت قدم اشخاص ہوں گے تو وہ سو پر غالب آجائیں گے۔

(۴)۔ان الارض یرثھا عبادی الصالحون(النساء:۱۰۵)
"یقیناً زمین کے وارث میرے صالح بندے ہوں گے۔

(۵)۔و من یتول اللہ و رسولہ و الذین آمنوا فان حزب اللہ ھم الغلبون (مائدہ:۵۶)
"اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کو اور مومنوں کو اپنا ساتھی بنائے گا تو (وہ بامراد اور سربلند ہو گا) بے شک اللہ کی جماعت ہی غالب رہنے والی ہے۔
اس غیبی مدد کے ظہور کی مثالیں ہر دور میں پائی جاسکتی ہیں۔خود اس امت کی ابتدائی تاریخ اس قسم کے واقعات سے بھری ہوئی ہے۔بدر و احد اور احزاب و حنین کے معرکوں میں خدا کی ان دیکھی فوجوں نے جو کرشمے انجام دیئے، قرآن کے صفحوں میں وہ آج بھی محفوظ ہیں۔
یہ ہے مخصوص ضابطہ کسی مومن گروہ کے عروج کا اور یہی مخصوص ضابطہ تھا جس نے امت مسلمہ کا ابتدائی دور غیر معمولی عظمت اور سربلندی کا دور بنادیا تھا۔

لیکن جہاں دوسری اہل ایمان جماعتوں کی طرح اس جماعت کو بھی قدرت کی یہ خصوصی نظر عنایت حاصل ہے وہیں اس کی ذمے داریاں بھی بہت نازک ہیں اور اس کے اس خاص وعدے کے ساتھ ایک خاص وعید سے بھی باخبر کیا جاچکا ہے جس کی طرف سے افسوس ہے کہ اس نے اپنے کان بند کر لیے ہیں اور یہی کان بند کر لینا ہی دراصل سے افسوس ہے کہ اس نے اپنے کان بند کر لیے ہیں اور یہی کان بند کر لینا ہی دراصل اس کے لیے غلط فہمیوں اور ہلاکتوں کا باعث بنا ہے۔اور وہ سوال پیدا کر دیا گیا ہے جس کا ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں۔اس اجمال کی شرح یہ ہے کہ قرآن نے اللہ تعالیٰ کی رحمتوں اور نعمتوں کا جو قانون بیان فرمایا ہے اس کی رو سے جس فرد یا گروہ پر اللہ تعالی کا فضل و کرم جتنا ہی زیادہ ہوتا ہے اس فضل و کرم کی ناشکری یعنی احکام الٰہی سے بے پروائی برتنے پر اس کی پکڑ بھی اتنی ہی زیادہ سخت اور ہولناک ہوتی ہے محکومی و نامرادی کی جتنی سزا وہ دوسری قوموں کو برے

اعمال کی پاداش میں دیا کرتا ہے اتنے برے اعمال کے ارتکاب پر اس قوم کو اس سے دوگنی یا کئی کئی سزائیں دیتا ہے جو اس کے کچھ مخصوص انعامات سے سرفراز کی جا چکی ہو۔ قرآن حکیم کی چند شہادتیں سنئے۔ سب سے پہلے خود نبی ﷺ کی ذات عالی مقام کو لے لیجیے۔ جن سے بڑھ کر محبوب اور مقرب بندہ عالم وجود میں آیا ہی نہیں۔ مگر یہ بات اس محبوب ترین بندے کو مخاطب کر کے کہی گئی تھی کہ :

ولولا ان ثبتناك لقد كدت تركن اليهم شيئاً قليلاً اذلا ذقنك ضعف الحيوة و ضعف المماة ثم لا تجدلك علينا نصيراً (بنی اسرائیل: ۷۴)

اگر ہم تم کو (حق پر) ثابت قدم نہ رکھتے تو قریب تھا کہ تم کفار کی طرف کچھ نہ کچھ جھک پڑتے۔ اگر ایسا ہو جاتا تو یقیناً ہم اس وقت تم کو زندگی اور موت دونوں میں (یعنی دونوں جہان میں) دوہرا عذاب چکھاتے پھر تم ہمارے خلاف کسی کو اپنا مددگار نہ پاتے۔

دوسری مثال ازواج مطہرات کی لیجیے۔ ان کو جہاں یہ رتبہ بخشا گیا تھا کہ وہ امہات المومنین ہیں اور ان کی حیثیت عام عورتوں جیسی نہیں ہے (یا نساء النبی لستن کاحد من النساء) (احزاب: ۳۳) نیز یہ کہ اگر وہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی صدق دل سے تابعداری کریں اور اچھے کام کریں تو عام لوگوں کی بہ نسبت ان کو دوگنا اجر ملے گا۔ و من یقنت منکن للہ و رسولہ و تعمل صالحاً فوتھا اجرھا مرتین و اعتدنا لھا رزقاً کریماً (احزاب: ۱۳۱) وہیں اس حقیقت سے بھی انہیں آگاہ کر دیا گیا تھا کہ :

یا نساء النبی من یات منکن بفاحشة مبینة یضاعف لھا العذاب ضعفین (احزاب: ۳۰)

اے نبی ﷺ کی بیویو! تم میں سے جو کوئی کھلی ہوئی بے حیائی کی مرتکب ہو گی اس کو دوگنا عذاب دیا جائے گا۔

افراد بعد قوموں کی مثال لیجیے۔ یہودی قوم وہ قوم ہے جس پر مدتوں انعامات الٰہی کی بارشیں ہوتی رہیں، جس کو دشمن سے بچانے کے لیے سمندر خشک کر دیا گیا۔ جس کی معاشی مشکلات کے وقت من و سلویٰ کا نزول ہوتا رہا۔ لق و دق بیابانوں میں جس کے سر پر رحمت کے فرشتے بدلیوں کی چھتریاں تانے ساتھ ساتھ چلتے تھے اور جس کو تمام اقوام عالم پر برتری دی گئی تھی۔ لیکن جب اسی سربلند اور محبوب جماعت اور موجودہ توریت کے لفظوں میں "خدا کی اپنی قوم" نے اپنے عہد بندگی کو فراموش کر دیا، اور احکام الٰہی سے سرتابی کر کے فسق و فجور میں غرق ہو گئی تو اس پر اللہ کا غضب ٹوٹ پڑا۔ اور اس طرح ٹوٹا کہ یہ قوم پہلے جتنی سربلند تھی اب اتنی ہی ذلیل ہو گئی۔ جس قدر محبوب تھی اسی قدر مغضوب ہو رہی۔

غرض یہ اللہ تعالیٰ کی ایک کبھی نہ بدلنے والی سنت ہے کہ اس کی نقمت بقدر رحمت ہوا کرتی ہے اور جیسا کہ چاہیے، یہ سنت ٹھیک عدل پر مبنی ہے چنانچہ عام انسانی فطرت بھی اسی روش پر عمل پیرا ہے۔ ہم ایک اجنبی آدمی سے اس حسن سلوک کے امیدوار نہیں ہوتے جس کی امید ہمیں اپنے اعزہ سے ہوتی ہے۔ ایک غیر شخص اگر ہماری بوتوں کو نہیں مانتا، یا اس کی تکذیب اور مخالفت کرتا ہے تو ہم اس پر زیادہ رنجیدہ یا مشتعل نہیں ہوتے۔ لیکن یہی بات اگر اپنے ایک نمک خوار نوکر یا ناز پروردہ بیٹے سے سرزد ہو جائے تو اس وقت ہمارے غم و غصہ کی انتہا نہیں رہتی۔ اور ہم اس کی اس حرکت کا وہ جواب دیتے ہیں جو ایک غیر آدمی کو کبھی نہیں دے سکتے۔ اس فرق کی وجہ بالکل کھلی ہوئی ہے۔ گیر کی مخالفت کا مطلب زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ وہ ایک سچی بات کا منکر اور دشمن ہے لیکن اس یگانے کی مخالفت کا مطلب یہ ہے کہ اس میں مخالفت حق کے ساتھ نمک حرامی بھی موجود ہے۔ اور یہ وہ جرم ہے جسے انسانیت کا ضمیر کبھی معاف نہیں کرتا۔ بالکل یہی اصول اللہ تعالیٰ بھی اپنے بندوں کے بارے میں برتتا ہے اور ان افراد یا قوم کو جو اس کی مخصوص عنایتوں سے سرفراز ہونے کے باوجود اس کے احکام کی مخالفت پر اتر آتی ہے عام حالت کی بہ نسبت دوگنی سزائیں دیتا ہے۔ کیونکہ وہ بیک وقت دو جرموں کی مرتکب ہوتی ہیں۔ ایک تو مخالفت حق کی دوسرے احسان کشی اور نمک حرامی کی۔

اسی سنت الٰہی کی روشنی میں امت مسلمہ کے ماضی اور حال کا جائزہ لینا چاہیے۔اللہ تعالیٰ کا اس امت کے ساتھ کیا معاملہ رہا ہے؟ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ اس نے اس امت کو تقریباً وہ ساری نعمتیں بھی بخشیں جو اس سے پہلے دوسری تمام امتوں کو دی گئی تھیں،اور ان کے علاوہ وہ نعمتیں بھی جو اب تک کسی امت کو نہیں ملی تھیں۔آخر یہ سارے جہان کی امامت کا منصب ۱ اور سب سے بہت امت ۲ ہونے کا اعزاز،

۱۔۲۔ کنتم خیر امة اخرجت للناس الخ (آل عمران:۱۱۰)

تم بہترین امت ہو جو تمام لوگوں کی (امامت ور ہنمائی) کے لیے برپا کی گئی ہے۔الخ

یہ امت ۱ وسط اور شہداء علی الناس ۲ کے خطابات، یہ .... اکمال ۳ دین اور اتمام نعمت کے انعامات اس سے پہلے بھی کسی امت کو ملے تھے؟ اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو پھر غور کیجیے کہ اس امت کی ذمہ داری کتنی بھاری ہوں گی؟ اور اس ذمے داریوں کو چھوڑ بیٹھنے کے نتائج کتنے خطرناک ہو سکتے ہیں؟ جزاو سزا کا جو قانون اللہ تعالیٰ کے محبوب ترین پیغمبر ﷺ اور پیغمبر ﷺ کی محترم ازواجؓ کے حق میں بھی اتنا بے لچک تھا وہ دوسروں کے بارے میں کوئی نرمی دکھا سکتا ہے؟ اگر "اس بہترین امت" کا عملی ریکارڈ ویسا ہی یا قریب قریب ویسا ہی ہے جس کے لیے وہ مبعوث کی گئی تھی تو یقیناً اسے اپنی موجودہ زبوں حالی پر تعجب کرنے کا پورا حق ہے۔لیکن اگر وہ اپنے مقصد وجود سے غافل ہو چکی ہے تو پھر اسے تعجب اپنی حالت پر نہیں، بلکہ اپنی سادہ لوحی اور اپنی خوش فہمی پر کرنا چاہیے۔آخر قدرت نے کب اور کس پر ظلم کیا ہے، جو آج وہ اس امت کے بارے میں انصاف کو بھول گئی ہو گی اور بھول کر اسے بلاوجہ پستی کے گڑھے میں دھکیل گئی ہو گی۔ذرا دیکھ تو لیجیے کہ اس امت کی ذمے داری کیا تھی؟ اور اس وقت وہ اسے ادا کس طرح کر رہی ہے؟ اس کی ذمے داریوں کا ضروری تعارف تو اگرچہ ابھی پچھلے باب میں نظروں سے گزر چکا ہے لیکن مناسب ہو گا کہ بعض اور تصریحات بھی سن لی جائیں، قرآن مجید مسلمانوں سے کہتا ہے کہ:

اتبعوا ما انزل الیکم من ربکم و لا تتبعوا من دونه اولیاء

"تمہارے رب کی طرف سے جو کچھ نازل ہوا ہے اس کی پیروی کرو اور اسے چھوڑ کر (دوسرے جھوٹے) خداوندوں کا اتباع نہ کرو۔"

مسلمانوں کا کیا رویہ ہونا چاہیے اور اسے کارزار حیات میں کون سا کردار ادا کرنا ہے؟ قرآن مجید کا صرف یہی ایک جملہ اس سوال کا مثبت اور منفی پر پہلو سے واضح جواب دے دیتا ہے اس سے یہ بھی صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ اسے کیا کرنا چاہیے اور یہ بھی کہ کیا نہ کرنا چاہیے۔ایک طرف تو ہر وہ حکم اور ہدایت جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئی ہو اس کے لیے واجب التعمیل ہے۔خواہ اس کا تعلق عقائد اور

۱،۲۔ و کذالك جعلنا کم امة وسطا لتکونوا شهدآء علی الناس (بقرة۔۱۴۳)

اور اسی طرح ہم نے تم کو ایک معتدل امت بنایا ہے تا کہ تم سب لوگوں کے لیے حق کے گواہ بنو۔

۳۔ الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی۔ (مائدہ:۳)

"آج میں نے تمہارے لیے دین کو مکمل کر دیا، اور تم پر اپنی نعمت تمام کر دی۔"

عبادات سے ہو، خواہ اخلاق اور معاملات سے، انفرادی مسائل سے ہو یا اجتماعی سے، مسجد اور مدرسہ سے ہو یا گھر اور بازار سے، اسمبلی اور پارلیمنٹ سے ہو یا بزم صلح اور میدان جنگ سے، غرض کوئی موقع ہو یہی احکام و ہدایت اس کے نظریوں کی بنیاد ہوں گے۔یہی اس کے رویے کا فیصلہ کریں گے۔اور انہی کا پابند ہو کر اسے رہنا پڑے گا۔دوسری طرف اپنے اس حقیقی مالک کے سوا (اور اس کے بھیجے ہوئے پیغمبر کے علاوہ) اگر کسی اور جانب سے کوئی نظریہ کوئی اسوہ، کوئی ضابطہ اور کوئی فیصلہ اس کے سامنے آتا ہے تو وہ لازماً اس کے لیے قابل رد ہے۔جیسا ضروری اس کے لیے یہ ہے کہ وہ اپنے رب کے ہر حکم کو بجالائے ٹھیک ویسا ہی ضروری امر یہ بھی ہے کہ ہر بیرونی شے کو دیوار پر دے مارے۔

قرآن کے اس مطالبے کو سننے کے بعد دو ہی راہیں اختیار کی جاسکتی ہیں، یا تو اس کا انکار کر دیا جائے، یا پھر غیر مشروط طریقے سے سر تسلیم خم کر دیا جائے۔انکار کرنے کے معنی جس طرح یہ ہیں کہ انسان قرآن کو حق نہیں مانتا اور امر و حکم کو اللہ تعالیٰ ہی کے لیے مخصوص نہیں سمجھتا؟ اسی طرح اس مطالبے کو غیر مشروط طریقے پر تسلیم کرنے کے معنی یہ ہیں کہ تسلیم کرنے والا قرآن کو بر حق مانتا ہی ہے وہ اس بات کا بھی اقرار و اعلان کر رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی کسی ایک ہدایت کی بھی پابندی سے گریز نہ کرے گا۔یہ ایک بالکل کھلی ہوئی اور سادہ سی حقیقت ہے کہ جس سے کسی اختلاف کی بابت سوچا بھی نہیں جاسکتا۔اب اس حقیقت کے ہوتے ہوئے دین کی صرف بعض پابندیوں کو قبول کرنے اور بعض سے کترا کر نکل جانے کا رویہ جتنا غیر معقول اور مضحکہ خیز ہو سکتا ہے اس کا اندازہ کرنا مشکل نہیں، جہاں تک قرآن کا تعلق ہے اس نے تو ایسی بین بین کی روش اختیار کرنے والوں کو اپنا فیصلہ ان صاف اور صریح لفظوں میں سنا رکھا ہے۔

افتومنون ببعض الکتاب و تکفرون ببعض فما جزاء من یفعل ذالک منکم الا خزی فی الحیاۃ الدنیا و یوم القیامۃ یردون الی اشد العذاب (بقرہ:۸۵)

"کیا تم کتاب الٰہی کی بعض باتوں کو مانتے ہو اور بعض کو نہیں مانتے، سو ایسا کرنے والوں کی سزا اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ دنیا میں ذلیل و خوار ہوں اور آخرت میں شدید ترین عذاب کی طرف لے جائے جائیں۔

قرآن کا یہ فیصلہ اس امر کا قطعی ثبوت ہے کہ اس کا مطالبہ کامل حوالگی کا ہے۔یعنی وہ کچھ بھی کہے اس پر اور صرف اسی پر عمل ہونا ضروری ہے۔اس نے اپنے پیروں کے لیے زندگی کے مختلف شعبوں میں جو حدیں قائم کر دی ہیں۔ان کے آگے قدم اٹھانے کی ان کے لیے کوئی گنجائش نہیں۔ایسا کرنے والوں کو وہ ظالم قرار دیتا ہے۔(و من یتعد حدود اللہ فأولئك هم الظالمون)(بقرہ:۲۲۹)"اس لیے قرآن پر ایمان لانے اور مسلم ہونے کے مطلب یہ ہوا کہ اس کے اندر جو کچھ ہے اس کے کسی ادنیٰ سے ادنیٰ جزو کو بھی ترک نہیں کیا جاسکتا۔

اب ذرا اک سرسری نظر سے یہ بھی دیکھ ڈالیے کہ یہ امت اپنی اس ذمے داری کو پورا کس طرح کر رہی ہے؟ دماغ کو تمام خارجی تاثرات سے آزاد کر کے "ما انزل الیکم من ربکم" اور اول سے آخر تک نظر ڈال جایئے اور اس کے بعد امت کے پورے عملی رویے کا گہرا جائزہ لیجیے۔پھر اندازہ کیجیے کہ قرآن کے احکام پر عمل ہو رہا ہے؟ چھوڑ دیجیے ان لوگوں کو جو "مسلمان" ہوتے ہوئے بھی اسلام کے اعلانیہ باغی اور اس کے اصولوں کی سچائی کے منکر ہیں۔یا جن کی زندگی کے لمحات ایک ایک کر کے اسلامی قوانین کے توڑنے بلکہ مٹانے ہی میں صرف ہوتے رہتے ہیں اور جن کو فقہی اصطلاح میں فاسق و فاجر کہا جاتا ہے ان افراد اور حلقوں کی طرف نگاہ دوڑایئے جو نیکی اور تقویٰ اور ایمان و عمل کے لحاظ سے اگلی صفوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔یہاں بھی آپ کو جو کچھ دکھائی دے سکتا ہے وہ زیادہ سے زیادہ یہی ہو گا کہ ان احکام الٰہی سے جن کا تعلق انفرادی زندگی سے ہے وہ غفلت برتتے، نمازوں اور روزوں کی پوری پوری پابندی ہوتی ہے، اور وظائف کی کثرت ہے، زکٰوۃ و صدقات ادا ہو رہے ہیں۔جھوٹ، غیبت، بدگوئی، اور بہتان تراشی سے زبان آلودہ ہونے نہیں پاتی۔کبر و غرور، نمود و ریا، خیانت ظلم اور غضب، رشوت اور حرام خوری، اور فتنہ و فساد کے دھبوں سے ان کے ایمان کا دامن پاک رہتا ہے لیکن ان تمام باتوں کے باوجود جہاں تک دین کے اجتماعی احکام و مسائل کا تعلق ہے اس سے غفلت و بے اعتنائی کا حال ان حلقوں میں بھی وہی ہے جو غیر متقی حلقوں میں نظر آتا ہے۔قرآن نے اگر زندگی کے صرف انفرادی پہلو سے ہی بحث کی ہوتی تب تو بلاشبہ اس طرح اتباع قرآن کا حق ادا ہو جاتا۔مگر وہ تو زندگی کے اجتماعی مسائل کو بھی اتنی ہی اہمیت کے ساتھ لیتا ہے جتنی اہمیت سے اس نے انفرادی مسائل کو کیا ہے، اس نے نماز، روزے، حج اور زکٰوۃ کے فرائض ادا کرنے اور دیانت، امانت، راست گوئی، اخلاص، وفائے عہد، حسن سلوک، اکل حلال و غیرہ اخلاق فاضلہ پر کاربند ہونے کی ہدایتیں دینے کے ساتھ ساتھ ہی یہ بھی کہا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق اور آقائی و فرمانروائی کا مستحق نہیں۔اس لیے اسی کو اپنا آقا اور سلطان مانو (لا الہ الا اللہ۔ان الحکم الا للہ۔یوسف:۴۰)۔الا لہ الخلق و الامر۔الاعراف:۵۴) خدا کی

بند گی کرو اور تمام باطل خداؤں کو چھوڑ دو۔(ان اعبدوا اللہ و اجتنبو الطاغوت۔ نحل:۳۶) خدائی اور فرمانروائی کے ان تمام جھوٹے مدعیوں کے دعوے تسلیم کرنے سے انکار کر دو، جو خدا کی بادشاہت سے باغی ہو کر اس کی رعایا پر اپنا حکم چلانا چاہتے ہیں۔(وقد امروا ان یکفروابہ۔ نساء:۶۰) ان لوگوں کا کہنا نہ مانو جو اللہ کے حقوق سے غافل اور اس کی حدود کو توڑنے والے ہیں۔(ولا تطیعوا امر المسرفین۔ شعراء:۱۵۱) جب فیصلہ کرو تو احکام الٰہی کے مطابق کرو۔(وان احکم بینهم بما انزل اللہ۔ مائدہ:۴۹) جب اپنا فیصلہ کراؤ تو انہی احکام کے تحت کام کرنے والی عدالتوں سے کراؤ، ورنہ غیر الٰہی قوانین کی عدالت میں اپنا معاملہ لے جانے والا منافق ہے۔(یریدون ان یتحاکموا الی الطاغوت۔ نساء ۶۰) اور قوانین الٰہی کو چھوڑ کر ان قوانین کے مطابق فیصلہ کرنے والا، ظالم ، فاسق، اور کافر ہے۔ (ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولٓئك هم الكافرون........................ الظالمون.............. الفاسقون۔ مائدہ:۴۴ تا ۴۷) کسی برائی اور کسی ظلم کو پروان چڑھانے میں کسی طرح کا تعاون نہ کرو۔(لاتعاونوا علی الاثم و العدوان۔ مائدہ:۳) کفر کے علم برداروں سے لڑو، یہاں تک کہ کفر کا علم سرنگوں ہو جائے اور اللہ ہی کی اطاعت رہ جائے۔(وقاتلوھم حتیٰ لا تکون فتنة ویکون الدین للہ۔ بقرہ:۱۹۳)................ جو کوئی اللہ اور اس کے رسول سے لڑے اس سے خدا کی زمین پر زندہ رہنے کا حق چھین لو۔ انما جزاء الذین یحاربون اللہ و رسولہ و یسعون فی الارض فساداً ان یقتلوا ....الخ۔(مائدہ:۳۳) جو چوری کرے اس کے ہاتھ کاٹ دو۔(و السارق و السارقة فاقطعوا ایدیهما۔ مائدہ:۳۸) جو بدکاری کرے اس کو سو کوڑوں کی سزا دو۔ الزانیة و الزانی فاجلدوا کل واحد منهما مئاة جلدۃ(نور:۲) جو کوئی کسی پاک دامن پر زنا کا جھوٹا الزام لگائے اس کو اسی(۸۰) درے لگاؤ۔ والذین یرمون المحصنات ثم لم یاتوا باربعة شهداء فاجلدوهم ثمانین جلدۃ(نور:۴)۔ جو کوئی کسی کو عمداً قتل کر دے اس کی بھی گردن اڑا دو۔ یا ایها الذین آمنوا کتب علیکم القصاص فی القتلیٰ الحر بالحر............... (بقرہ:۱۷۸) غرض یہ اور انہی جیسے بے شمار احکام شریعت ایسے بھی ہیں جو ہماری انفرادی زندگی سے آگے بڑھ کر ہماری اجتماعی زندگی کو بھی اپنا پابند بنا کر رکھنا چاہتے ہیں اور یہ سب کے سب اسی قرآن میں موجود ہیں، جس میں نماز، روزے کے احکام درج ہیں اس لیے جب تک ان احکام پر بھی عمل نہ کر لیا جائے یہ کس طرح کہا جا سکتا ہے کہ اتباع دین اور عمل بالقرآن کا حق ادا ہو رہا ہے اس حقیقت کے پیش نظر اس جماعت کے لیے جس نے اللہ کی کتاب پر پورا پورا عمل کرنے کا عہد کیا ہے یہ سارے احکام بھی بالیقین اسی طرح واجب التعمیل ہیں جس طرح وہ دوسری قسم کے احکام۔ بلکہ امر واقعی تو یہ ہے کہ اپنی ساری اہمیتوں کی بنا پر ان میں سے اکثر احکام ایسے ہیں جو مدار ایمان اور شرط نجات ہیں۔ اس لیے وہ ایک مسلمان کے لیے اولین توجہ کے مستحق ہیں۔ لیکن "خالص دینی اور متقی حلقوں" میں بھی ان پر عمل کا سراغ ملنا تو در کنار، عمل کی خواہش کا وجود بھی تقریباً نایاب سا ہے۔ آج ہمارے معبود اور شہنشاہ اللہ تعالیٰ ضرور ہے مگر مسجد کی چار دیواریاں اس کی معبودیت اور شہنشاہت کی آخری حدیں ہیں اور مسجد سے باہر ہمارے آقا اور حکمران وہ لوگ ہیں جو ہماری ہی طرح مخلوق ہیں۔ اور خود بھی اسی ایک حاکم حقیقی کے قانون کی پیروی کے لیے پیدا ہوئے ہیں۔ ان میں سے اکثر تو وہ ہیں جو اللہ اور رسول ﷺ کے علانیہ باغی اور کفر و ضلال کے امام ہیں اور کچھ ایسے بھی ہیں جو مسلمان ہیں۔ لیکن ایسے مسلمان جنہوں نے اللہ کے ان حقوق فرمانروائی کو جن کا تعلق دنیا میں انسانوں کی اختیاری زندگی سے ہے اپنے ہاتھوں میں لے لیا ہے۔ قریب قریب پوری امت مسلمہ انہی دو قسم کے "ارباباً من دون اللہ" کو اپنا صاحب امر و حکم بنائے ہوئے ہے۔ اب اس کے لیے قانون وہ ہے جو یہ خداوندان ارضی نافذ کریں۔ نہ کہ وہ جو کتاب و سنت میں ہے پھر جب انسانی زندگی کے ایسے بنیادی مسئلے میں اس امت نے پہلے مداہنت کی اور بالآخر تعاون کی پالیسی اختیار کر لی اور اپنے ہی جیسے انسانوں کے ہاتھوں میں اپنے نظام سیاست کی باگیں دے کر انہی کو اپنا صاحب امر تسلیم کر لیا تو اس کے وہ بہت سے مسائل زندگی جن کا تعلق براہ راست حکومت سے ہوا کرتا ہے آپ سے آپ غیر اسلامی بنیادوں پر طے ہونے لگے۔ اب اس کے کتنے ہیں ہی اصول زندگی........... اس کے سیاسی نظریات، اس کے معاشی تصورات اور اس کے عمرانی افکار............... کی بنیاد ہی

بدل گئی اور اس کی زندگی کا پورا ڈھانچہ اور مسائل زندگی پر غور و فکر کرنے کا طرز ہی کچھ اور ہو گیا۔ اب وہ اللہ وحدہٗ لاشریک لہٗ کی غیر منقسم حاکمیت کی بجائے انسانوں کی حاکمیت کی داعی اور علم بردار ہے۔ اب وہ اس نظام زندگی کو، جو اپنے اصول و فروع میں سر تا پا غیر اسلامی، غیر قرآنی بلکہ کافرانہ ہے نہ صرف انگیز کر رہی ہے بلکہ اس کی مشین چلانے میں مسابقت دکھارہی ہے اب اس کے افراد نہایت اطمینان کے ساتھ اللہ کے نازل کردہ قوانین کو چھوڑ کر انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین کے مطابق فیصلہ کرتے اور کراتے ہیں۔ حالانکہ انہیں علم ہے کہ اس معاملہ میں اللہ کا حکم یہ نہیں ہے۔ اب ارتداد، چوری، زنا، بہتان، اور قتل کے جرائم کی سزائیں کہیں بھی وہ نہیں دی جاتیں جو کتاب وسنت میں مقرر ہیں حالانکہ انہوں نے اپنے فرمانروائے حقیقی سے عہد کیا تھا اور وفاداری کا حلف اٹھایا تھا کہ ہم ان تعزیرات کو جاری کریں گے اس طرح قرآن کا ایک بڑا حصہ صرف کتابت اور تلاوت کے لیے محدود ہو کر رہ گیا ہے اور اس کے ماننے والوں کی عملی زندگی سے اس کا کوئی تعلق باقی نہیں رہا۔ اگر ہمارے اندر قرآنی تعلیمات کا سچا فہم اور اسلام کی صحیح بصیرت موجود ہو، اور نفس کی چالبازیوں نے ہماری روح ایمانی کو تھپکیاں دے کر سلا نہ دیا ہو تو یہ اعتراف کرنا پڑے گا کہ قرآن کے ساتھ ہم بڑی حد تک وہی سلوک کر رہے ہیں جو اہل کتاب نے تورات اور انجیل کے ساتھ کیا تھا۔ البتہ قرآن اللہ تعالیٰ کا چونکہ آخری ہدایت نامہ تھا جس کے باعث اس نے خود اس کی حفاظت کا وعدہ کر رکھا ہے اس لیے یہ تو ممکن نہیں کہ گزشتہ آسمانی کتابوں کی طرح اس کتاب میں بھی لفظوں کا ردوبدل اور عبادتوں کی کاٹ چھانٹ کی کوئی جسارت کامیاب ہو سکے۔ لیکن اس کے علاوہ اور کوئی ظلم اور خیانت نہیں ہے جو دوسری امتوں نے اپنے صحیفوں کے ساتھ روا رکھی ہو اور مسلمان اس سے باز رہے ہوں، عملی طور پر انہوں نے قرآن کے ایک حصے کو فراموش کر رکھا ہے۔ مراحل زندگی میں اس کو آگے رکھنے کے بجائے پیٹھ پیچھے رکھ چھوڑا ہے، "اور کچھ اقرار اور کچھ انکار" کی روش پر پورے اطمیان کے ساتھ چلے جا رہے ہیں اس لیے کوئی وجہ نہیں کہ قدرت افتومنون ببعض الکتاب وتکفرون ببعض کا الزام ایک محدود معنی ہی میں سہی ان پر عائد نہ کرے اور پھر خزی فی الحیاۃ الدنیا کی اس پاداش کا انہیں مستحق نہ ٹھیرائے جس کا اس کا قانون مطالبہ کرتا ہے۔

تیسرا باب

چہ باید کرد؟

فرض کی پکار

اگر ہم یہ پسند نہیں کرتے کہ ہماری موجوہ حالت جوں کی توں برقرار رہے، اور ہم پر خود اپنے وجود سے دشمنی کرنے کا ایک فرض ناشناس گروہ ہونے کا جو واقعی الزام لگ چکا ہے وہ نہ خلق کے سامنے سے دور ہو نہ خدا کے سامنے سے۔ تو اس کی واحد تدبیر صرف یہی ہو سکتی ہے کہ ہم خود شناس نہیں، اپنا فرض یاد کریں اور پھر اسی نصب العین کے ہو رہیں۔ جس کے سوا ہمارا کوئی دوسرا نصب العین نہیں اور نہ مسلمان ہوتے ہوئی کبھی ہو سکتا ہے۔ یہ بات نہ کسی خوش عقیدگی کی پیداوار ہے نہ ماضی پرستی کا نتیجہ، بلکہ یہ اس کتاب کا فیصلہ ہے جسے ہم انسانی کلام نہیں بلکہ الٰہی کلام مانتے ہیں۔ جس کو سچی ہدایت اور یقینی علوم کا سرچشمہ قرار دیتے ہیں اور جس کی ہر بات کو بلاچون وچرا اس تسلیم کرنے کا ہم نے عہد کیا ہے جس وقت یہ کتاب نازل ہو رہی تھی اس وقت پچھلی آسمانی کتابوں کے پیرو (یہود و نصاریٰ) کچھ اسی قسم کے حالات سے دوچار تھے۔ جب اس نے ان کی اعتقادی گمراہیوں اور عملی براہیوں پر تنقید کی اور ان کے برے انجام سے انہیں ڈرایا اور اللہ کا سچا دین پیش کر کے اس کے اتباع کی انہیں دعوت دی تو ان کی رگوں میں الٹی

جاہلی حمیت کی آگ بھڑک اٹھی، کیونکہ انہیں غصہ تھا کہ ہم خود آسمانی مذہب رکھنے والے ہیں۔ بلکہ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے لاڈلے ہیں۔ اس لیے انہیں گوارا نہ ہو سکا کہ کوئی اور ان کے سامنے ہدایت اور امامت کا علم بردار بن کر آئے، نتیجہ یہ ہوا کہ جواب میں وہ جارحانہ حملوں پر اتر آئے، اور ایک طرف اسلام کی تردید و تکذیب پر، دوسری طرف اپنی عظمت و امامت پر زور بیان صرف کرنے لگے، اللہ تعالیٰ نے ان کی ان کٹھ حجتیوں کے اور ان کے اس ادعا کے جواب میں فرمایا:

قل یا اھل الکتاب لستم علی شیءحتی تقیموا التوراۃ و الانجیل و ما انزل الیکم من ربکم (مائدہ:٦٨)

"اے پیغمبر ان لوگوں سے کہ دو کہ اے اہل کتاب! تم ہر گز اصل پر نہیں ہو جب تک کہ تم قائم نہ کرلو تورات اور انجیل کو، اور اس چیز کو جو تمہارے رب کی طرف سے تمہاری طرف اتری ہے۔"

یعنی تم اپنی موجودہ حالت میں رہتے ہوئے ہر گز اس امر کے مستحق نہیں ہو کہ دلیل و برہان کے ساتھ حق کے بارے میں کلام کر سکو۔ تم نے وہ بنیاد ہی کھود کر پھینک رکھی ہے جس پر تمہارے وجود ملی کی عمارت کھڑی تھی۔ اس معاملہ میں تم بحث و جدال کے حقدار اسی وقت ہو سکتے ہو، جب تم ان ہدایات پر کاربند ہو جاؤ، اور اپنی زندگیوں کو ان تمام احکام کا پابند بنا دو جو سلطان حقیقی کی جانب سے تم ہر مختلف وقتوں میں نازل ہوتے رہے ہیں۔ تم نے کتاب الٰہی کے جن حصوں کو اپنی دنیائے عمل سے خارج کر رکھا ہے ان کو از سر نو نافذ کرلو، جن صداقتوں کا تمہیں علم دیا گیا تھا ان کی حفاظت اور بر ملا اشاعت کا بھولا ہوا فریضہ یاد کرلو۔ اور تمہاری زندگی کا جو مقصد ٹھیرایا گیا تھا، اسے پھر اپنالو۔

اب غور کیجیے اسی فیصلہ قرآنی کی روشنی میں خود اپنے معاملہ پر امت مسلمہ کے اتباع کی عملی حالت بھی جب یہی ہے کہ کتاب الٰہی کا ایک حصہ صرف برکت تلاوت کے لیے رہ گیا ہے اور اس سے اس کا کوئی تعلق باقی نہیں رہا تو انصاف کیا کہتا ہے؟ کیا اس کے سوا کچھ اور کہ اسے بھی **لستم علی شیء** کا سزاوار ٹھیرایا جائے؟ اور جب تک وہ "قرآن کی اقامت" نہ کرے اس وقت تک اسے **شھدآء حق** اور **خیرامۃ** ہونے کے اعزاز کا حقدار نہ سمجھا جائے؟ یقیناً نہیں اور بلاشبہ یہ اس کی ایک طرح کی دھاندلی ہوگی۔ اگر وہ ایک اعزاز کے تمغے کو اس حالت میں بھی اپنے سینے پر آویزاں کیے رہے۔ اس لیے اگر وہ اپنے فرض کا بار گراں پھر سے اپنے کاندھوں پر اٹھالے، اور دنیا کے ہر کام، ہر ہنگامے، ہر مشغولیت اور ہر دلچسپی سے منہ موڑ کر اپنی نظریں اسی ایک کام پر جمالے۔ یہ اس کے منصب اور اس کے مقصد وجود کا مطالبہ ہے۔ اس کے ملی تشخص کی بحالی کی اس کے سوا کوئی تدبیر ہی نہیں کہ وہ اس مطالبے کے آگے سر جھکادے۔

ملی نجات کی شاہراہ

اسی طرح اس امت کے لیے دنیوی عزت و اقبال کی بازیافت کی راہ بھی اس کے سوا کوئی دوسری نہیں، جس کا نا قابل انکار ثبوت قرآن مجید کا وہ ارشاد ہے جو اس نے ذلت و مسکنت کے مارے ہوئے بنی اسرائیل کے بارے میں فرمایا تھا۔

ولو ان اھل الکتاب آمنوا و اتقوا الکفرنا عنھم سیاتھم و لا دخلنا ھم جنت النعیم و لو انھم اقاموا التوارۃ و الانجیل و ما انزل الیھم من ربھم لاکلوا من فوقھم و من تحت ارجلھم (مائدہ:٦٥،٦٦)

"اگر یہ اہل کتاب ایمان رکھتے اور خدا ترسی کی راہ چلتے تو ہم ان کی برائیاں ان سے دور کر دیتے اور نعمت کے باغوں میں انہی داخل کرتے، اور اگر وہ تورات اور انجیل کو اور ان ہدایتوں کو جو ان کے رب کی طرف سے انہیں پہنچی ہیں قائم کرتے تو اپنے اوپر سے بھی رزق بٹورتے اور اپنے قدموں کے نیچے سے بھی۔"

یہ تھی وہ تدبیر جس کے ذریعے امت اسرائیل کو اس کا کھویا ہوا اقبال واپس مل سکتا تھا، اس ارشاد قرآنی کی روشنی میں امت مسلمہ کا معاملہ بھی کچھ مشکل نہیں رہ جاتا، مرض کی یکسانی چاہتی ہے کہ علاج بھی ایک ہی ہو۔ ہلاکت و نامرادی جس راہ سے اہل کتاب کے یہاں آئی تھی۔ آپ دیکھ چکے ہیں کہ اہل قرآن کے پاس بھی اسی راہ سے آئی ہے، اس لیے کھلی بات ہے کہ اس سے نجات بھی اسی طریقے سے مل سکتی تھی۔ جس کی اہل کتاب کو تلقین کی گئی تھی۔ قرآن کہتا ہے، اور ظاہر ہے کہ اسی کا کہنا ایک مومن کے لیے حرف آخر کا حکم رکھتا ہے کہ اہل کتاب نے خداوندی احکام و ہدایات کے کچھ حصوں کو چھوڑ دیا اور بھلار کھا تھا۔ جس کے نتیجے میں رحمت الٰہی ان سے روٹھ گئی۔ اور غضب خداوندی ان پر ٹوٹ پڑا، جس سے نجات کی واحد تدبیر صرف یہ تھی کہ ان احکام و ہدایات پر وہ پھر سے عمل کرنے لگتے، اب اگر کسی کے دل و دماغ قرآن حکیم کی "زبان" سمجھنے کی صلاحیتوں سے بالکل محروم نہیں ہو چکے ہیں تو اس کے لیے اس پیغام کا سمجھ لینا ذرا بھی دشوار نہیں جس کی طرف وہ اپنے اس ارشاد میں صاف طور سے انگلی اٹھا کر اشارہ کر رہا ہے۔ چنانچہ جس کسی کو اللہ تعالیٰ نے ہوشمندی اور عبرت کے کان دیئے ہیں۔ وہ قرآن کے انہی لفظوں میں سے یہ آواز بھی سن سکتا ہے کہ :

"اگر قرآن کے پیرو ایمان رکھتے اور خدا ترسی کی راہ چلتے تو ہم ان کی برائیاں ان سے دور کر دیتے اور نعمت کے باغوں میں انہیں داخل کرتے اور اگر وہ قرآن کو قائم کرتے تو اپنے اوپر سے بھی رزق بٹورتے اور اپنے قدموں کے نیچے سے بھی۔"

نیز یہ کہ :

"اے اہل قرآن! تم ہر گز کسی اصل پر نہیں جب تک کہ قرآن کو قائم نہ کرو۔"

غرض "اقامت قرآن" دوسرے لفظوں میں اقامت دین ہی وہ واحد نسخہ شفا ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اس امت کے لیے پہلے تجویز فرما دیا تھا اور یہ بتا دیا تھا کہ یہی وہ چیز ہے جس پر تمہاری اخروی سعادت کا بھی انحصار ہے اور تمہاری دنیوی فلاح کا بھی، تم کو جب بھی ان چیزوں کی تلاش ہو، اس کے لیے راستہ یہی اختیار کرنا، باقی ہر طرف سراب ہی سراب ہو گا جہاں ٹھوکریں کھانے کے سوا تمہارے کچھ ہاتھ نہ لگ سکے گا۔ یعنی قرآن ہمیں پھر اسی مقام پر واپس جانے کا حکم دے رہا ہے جہاں سے ہم ہٹ آئے ہیں، حضرت امام مالکؒ نے یہ پیش گوئی نہیں کی تھی کہ نہ اپنے کسی کشف کا اظہار کیا تھا جب فرمایا تھا کہ :

لن یصلح اخر ھذہ الامۃ الا بما صلح بہ اولھا

یہ امت اپنے آخری دور میں بھی بہر حال اسی چیز سے خیر و اصلاح پا سکے گی جس سے اس نے اپنے ابتدائی دور میں پائی تھی۔"

بلکہ یہ ایک روشن حقیقت تھی جس کا ان کے مومنانہ بصیرت نے پورے تیقن سے ادراک کیا اور جس کے سوا کسی صاحب ایمان کے ذہن میں کوئی دوسری بات آہی نہیں سکتی۔ جہاں تک "اصلاح دین" کا تعلق ہے اس کے اتباع دین کے سوا اور کوئی ذریعہ تصور ہی میں نہیں آسکتا۔ کھلی بات ہے کہ دینی سدھار دین ہی کے اپنانے سے ہو سکتا ہے رہ گئی امت کی "دینی اصلاح" تو یہ بھی اس کے شہادت حق کے منصب پر فائز جماعت ہونے کے باعث اسی دین سے وابستہ ہے۔ کیونکہ اسے جو عروج و اقبال بھی بخشا گیا تھا وہ سب اسی نصب العین سے وفاداری کا صلہ تھا اور اس سے اللہ تعالیٰ نے فتح و نصرت کے جتنے وعدے کیے تھے وہ سب اسی اقامت دین کی شرط سے مشروط تھے چنانچہ جب مسلمانوں کو یہ بشارت دی گئی کہ تم ہی سربلند ہو گے اور تمہارے مقابلے میں تمہارے دشمنوں کا انجام محکومیت ہو گا (**انتم الاعلون**) تو اسی کے ساتھ (**ان کنتم مومنین**) کی بھی شرط لگا دی

تھی۔ ظاہر ہے یہ مشروط وعدہ کوئی وقتی اور خصوصی وعدہ نہیں تھا بلکہ ایک ابدی اور اصولی وعدہ تھا۔ احادیث سے تو یہاں تک معلوم ہے کہ خود اس امت کے اندر بھی خاص طور پر وہی گروہ اس کے اعزاز واقبال کا نمائندہ اور علم بردار ہو گا جو اقامت دین کے فریضے کو پورا کر رہا ہو گا۔

نبی ﷺ فرماتے ہیں:

ان هذا الامر فی قریش لا یعادیهم احد الا کبة الله علی وجهه ما اقاموا الدین (بخاری بحوالہ مشکوۃ)

بلا شبہ یہ خلافت اس وقت تک قریش میں رہے گی جب تک وہ دین کو قائم رکھنے کا فریضہ ادا کرتے رہیں گے جو کوئی بھی ان سے عداوت کرے گا اللہ اس کو اوندھا گرا دے گا۔

پچھلی بحثوں کا خلاصہ

اب تک کی تمام بحثوں سے چند اصولی نکتے نکھر کر سامنے آجاتے ہیں:

ایک یہ کہ اس امت کا مقصد وجود اور نصب العین اللہ کے دین کی اقامت تھا اور ہے۔

دوسرا یہ کہ اس فریضے کو انجام دینے میں اللہ تعالیٰ کی غیبی اعانتیں اس کے شامل حال رہتی ہیں اور در اصل یہی غیبی اعانتیں تھیں جن کے طفیل وہ مثالی عزت واقبال سے سرفراز ہوئی تھی۔

تیسرا یہ کہ اس امت کے عروج وزوال کا اصل انحصار طبعی قوانین اور مادی اسباب وتدابیر پر نہیں ہے بلکہ اخلاقی قانون پر ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ اس کا عروج اپنے اس فریضے کے بجالانے پر موقوف ہے جس کے لیے وہ مبعوث کی گئی ہے اور موقوف بھی اس طرح کہ اگر اس نے اس فرض سے پہلو تہی کی تو دوسری قوموں کی بہ نسبت وہ اللہ تعالیٰ کے دربار سے دوگنی سزا کی مستحق ہو گی۔

چوتھا یہ کہ اس امت کے موجودہ حالات اس بات پر صاف دلالت کرتے ہیں کہ اس نے کتاب اللہ کے ایک بڑے حصے کو عملاً چھوڑ رکھا ہے اور اقامت دین کے فریضے سے غافل ہو گئی ہے۔

پانچواں یہ کہ قرآنی فیصلے کی رو سے اس امت کے لیے فلاح ونجات کا راستہ ہر طرف سے بند ہے ماسوا اس ایک راستے کے کہ وہ اپنے فریضہ حیات کو پہچان لے اور اللہ کے دین کو از سر نو قائم کر دینے میں تن من دھن سے لگ جائے۔ ورنہ اگر اس نے اس راہ کے سوا کوئی اور راہ اختیار کرنے کی کوشش کی تو اس کی تمام تدبیریں اور کوششیں نہ صرف یہ کہ ضائع جائیں گی، بلکہ وہ اسے اس کے اپنے مقام سے اور دور پھینک دیں گی۔ اور رہا سہا ملی وقار واقبال بھی چھین لیں گی۔ وہ دوسری قوموں کے مقابلے میں دین کا سر رشتہ چھوڑ کر کبھی آگے نہیں بڑھ سکتی اور اگر بظاہر کوئی سربلندی اس کو مل بھی گئی تو وہ غیروں کا عطیہ ہو گی جس کا وجود بھی غیروں کے رحم وکرم پر ہو گا اور یہ بجائے خود ایک بڑی ذلت ہے۔